رشید احمد شیخ

غازی علم الدین شہید

غازی علم الدین شہید بازار سریانوالہ کے ایک محلہ جسے کڑھ چیتے والا کہتے تھے میں مورخہ 1908، 12 - 4 بروز جمعرات پیدا ہوئے۔

شجرے کے مطابق سلسلہ کچھ اس طرح ہے:۔

علم الدین ولد طالع مند ولد عبدالرحیم ولد اللہ جوایا ولد فضل دین ولد عبداللہ ولد محمد عیسیٰ ولد بابالہنا۔

بابالہنا دراصل سکھ تھے۔ ان کا نام لہنا سنگھ تھا انہوں نے نوان عمری ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کا نام برخوردار رکھا گیا۔ موضع بھڈانہ تحصیل و ضلع لاہور میں ان کا مزار ہے جہاں کے وہ رہنے والے تھے۔

غازی علم الدین شہید کے ایک بڑے بھائی تھے اور ایک بہن تھی۔ بھائی کا نام شیخ محمد دین تھا اور والد ماجد کا نام میاں طالع مند تھا۔ مشترکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے حصول رزق حلال ایک مسئلہ تھا اور پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بھی بہت ہی کم ہوا کرتی تھی۔

میاں طالع مند (والد غازی علم الدین شہید) نے اوائل عمر ہی میں کسب معاش کی خاطر نجاری کا پیشہ اختیار کر لیا اور اتنے ماہر اور چابک دست فنکار بن گئے تھے کہ نظام دکن کی انتظامیہ نے دہلی میں عثمان علی خاں کی رہائش کے لئے جو بنگلہ بنوایا اس کا تمام چوبی کام انہی کے ہاتھوں ہوا اور محنت صفائی ایمانداری اور لگن سے کام کرنے کے سلسلہ میں نظام نے انہیں سند حسن کارکردگی دی۔ غازی علم الدین نے ابتدائی تعلیم محلہ کی مسجد میں امام مسجد سے حاصل کی۔ بعد ازاں انہیں بازار نوہریاں کے ایک مدرسہ میں داخل کروا دیا گیا مگر چونکہ طبیعت تعلیم کی طرف مائل نہ تھی۔ انہوں نے وہاں رغبت سے نہ پڑھا اور مارچ یا یکم اپریل 29ء کی شام کا ذکر ہے کہ غازی صاحب اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ دہلی دروازہ کے باغ میں جلسہ سننے گئے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری مقرر تھے۔ تمام رات تقریر ہوتی رہی۔ صبح کی اذان کے وقت جلسہ ختم ہوا۔ موضوع کتاب رنگیلا رسول ہی تھا۔ غازی صاحب نے اپنے بڑے بھائی صاحب سے اس کتاب کے مندرجات کے متعلق اور پہلے دو افراد جنہوں نے راج پال ناشر کتاب رنگیلا رسول کو قتل کرنے کی سعی کی تھی استفسار کیا۔ تفصیل سننے کے بعد کچھ خاموش رہنے لگے۔ 29-4-5 کو دوبارہ اپنے بھائی سے اسی موضوع پر گفتگو کی۔ بھائی نے بتایا کہ "سوامی دیانند کا ایک شاگرد مہاشہ کرشن ہے جو روزنامہ پرتاپ کا مدیر ہے اس نے یہ کتاب لکھی ہے جس میں رسول پاک رسالت مآب پر فحش الزامات تراشے ہیں مگر ڈرپوک اتنا ہے کہ مسلمانوں کے غم و غصہ سے بچنے کے لئے پنڈت چمپاوتی کا فرضی نام بطور مصنف لکھ دیا ہے مگر جس شخص نے یہ کتاب چھپوائی ہے اس نے پورا نام اور پتہ کتاب پر درج کر دیا ہوا ہے" غازی علم الدین شہید نے بڑے بھائی سے دوبارہ دکان کا پتہ جہاں راج پال بیٹھتا تھا سمجھنے کی کوشش کی۔

گھر والے غازی علم الدین شہید کی خاموشی سے سمجھ نہ پائے۔ 29-4-6 کو غازی علم الدین شہید قریباً ایک بجے دوپہر راجپال کی دکان پر پہنچ گیا۔ راجپال کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ چونکہ راجپال خود ہی گدی پر بیٹھا ہوا تھا اس نے جواباً کہا کہ وہ خود ہی راجپال ہے مگر پھر فوراً ہی سہم گیا اور پوچھنے لگا کہ کیا کام اس سے 'غازی علم الدین نے اسی وقت راجپال پر چھری کا ایک بھرپور وار کیا اور یہ کہتے ہوئے کہ بس یہی کام تھا راجپال کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا۔ شور مچ گیا کہ راجپال قتل

مختصری ہی تعلیم حاصل کر پائے۔ بڑے بھائی شیخ محمد دین نے بھی کوئی تعلیمی نصاب نہ تو مکمل کیا تھا تاہم وہ اتنا پڑھ چکے تھے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی سوسائٹی میں بیٹھنا اور سیاسی و دینی مسائل پر گفتگو کرنا اور سننا پسند کرتے تھے۔ انہوں نے ریلوے ورکشاپ لاہور میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ جہاں وہ سپیشل پنجر و ینگز کا فرنیچر بنایا کرتے تھے۔ انہوں نے یہ کام

اپنے والد صاحب ہی سے سیکھا۔ غازی علم الدین کی شہادت سے پہلے کی زندگی دنی مصروف و معروف زندگی نہیں کہی جاسکتی بہر حال انہوں نے بھی نجاری کا پیشہ اپنے والد بزرگوار ہی سے سیکھا اور فرنیچر وغیرہ بنانے کا کام اپنے بڑے بھائی سے سیکھا۔ مختلف پرائیوٹ ورکشاپس میں کام کرتے رہے مگر اکثر دینی معاملات میں مذہب اسلام کی تائید و حمایت میں الجھ پڑتے تھے اور مختلف جگہوں سے ملازمت چھوڑنے کی وجہ بھی یہی ہوتی تھی۔ اپنے والد اور بھائی کے ساتھ کام کر کے مہارت حاصل کر لی تھی لہٰذا اپنے والد صاحب کے ساتھ یکم جنوری 28ء کو کوہاٹ چلے گئے جہاں بنوں بازار میں فرنیچر کا کام کرتے رہے۔ قریباً ایک برس بنوں میں کام کرنے کے بعد اپنے والد صاحب ہی کے ساتھ مارچ 29ء میں لاہور میں آئے۔ ان دنوں میں جبکہ وہ یہاں قیام کر رہے تھے۔ ان کی سگائی رشتے کے ایک ماموں کی بیٹی سے کر دی گئی۔ وہ فرنیچر بنانے کے سلسلہ میں اتنی سمجھ بوجھ حاصل کر چکے تھے کہ انہوں نے لاہور کی نسبت کوہاٹ میں کام کاج چلانے کو زیادہ ذریعہ آمدن قرار دیا اور والد صاحب کے ساتھ واپس کوہاٹ جانے کی تیاری کرنے لگے مگر قدرت نے ان سے کچھ اور ہی کام کروانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

ان ہی ایام میں "رنگیلا رسول" کتاب کے سلسلہ میں جلسوں جلوسوں اور اخبارات میں لے دے ہو رہی تھی۔ غازی صاحب کے بڑے بھائی شیخ محمد دین صاحب مجلس احرار کے منعقدہ جلسوں میں ضرور جاتے تھے اور خلافت مومنٹ کی کارکردگی کو بھی بہت سراہا کرتے تھے۔ غالباً یہ 31 مارچ 29ء ہو گیا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں پولیس پہنچ گئی اور غازی علم الدین کو حراست میں لے لیا گیا۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لوئس صاحب کی عدالت میں چالان پیش کیا گیا۔ انہوں نے 29-4-10 کو مقدمہ سیشن جج کی عدالت میں بھیج دیا۔ مسٹر سلیم ایڈووکیٹ نے وکالت کی اور معقول طریقے سے دلائل پیش کئے۔ مسٹر ٹیپ سیشن جج تھا۔ اس نے 29-5-22 کو موت کا حکم سنا دیا۔ ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی گئی۔ محمد علی جناح صاحب جسٹس براڈن اور جسٹس جانسن کی ڈویژن بینچ کے سامنے پیش ہوئے مگر اپیل خارج ہو گئی۔ حالانکہ قابل فہم اور مبنی بہ حقیقت دلائل پیش کئے گئے تھے۔ پریوی کونسل میں اپیل کر دی گئی مگر 29-X-15 کو وہاں سے بھی اپیل خارج کر دی گئی اور یوں سزائے موت بحال رہی۔ مسٹر سلیم ایڈووکیٹ، میاں عبدالعزیز، ایڈووکیٹ ڈاکٹر تصدق حسین خالد، ڈاکٹر محمد عالم، احمد دین ایڈووکیٹ اور سب سے بڑھ کر جناح صاحب نے نہایت تن دہی سے مقدمہ لڑا مگر نتیجہ وہی نکلا جو غازی علم الدین شہید کی خواہش مبنی بہ حقیقت تھی۔

ہندو مسلم فساد کے ڈر سے غازی علم الدین شہید کو پریوی کونسل کے فیصلہ سے پہلے ہی 29-X-3 کو ساڑھے نو بجے رات بذریعہ بس لاہور سنٹرل جیل سے گوجرانوالہ لے جایا گیا۔ وہاں سے بذریعہ ٹرین رات ایک بجے کے قریب میانوالی بھیج دیا گیا۔ ٹرین جمعہ کے روز دو بجے کے بعد میانوالی پہنچی۔ پولیس کی بہت سی نفری ساتھ تھی۔ اسی روز غازی کو میانوالی جیل میں قاتلوں والی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ پریوی کونسل سے اپیل خارج ہو جانے کے بعد جب بلیک وارنٹ جاری ہو گیا تو آخری ملاقات کیلئے گھر والوں کو اطلاع دی گئی۔ سبھی عزیز و اقربا میانوالی روانہ ہو گئے۔

29-X-31 کو صبح نماز فجر کے فوراً بعد غازی علم الدین شہید کو تختہ دار پر کھینچ کر واصل بالحق کیا گیا۔ غازی نے وصیت کی تھی کہ انہیں میانی صاحب لاہور میں دفن کیا جائے مگر فرنگیوں کا خیال تھا کہ اگر وصیت کے مطابق میت لاہور بھیجی گئی تو میانوالی سے لیکر لاہور تک کے تمام گاؤں کے مسلمان لاہور پہنچ جائیں گے اور ہندو مسلم فساد ہو جائے گا۔ جس کا روکنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ یہ رپورٹ ملنے پر اس وقت کے گورنر پنجاب سرڈی مونٹ مورنسی نے ہدایت جاری کر دی کہ علم الدین کی میت کو میانوالی جیل میں قیدیوں کے قبرستان میں دبا دیا جائے اور ایسا ہی ہوا۔

غازی علم الدین شہید کی موت کو مسلمان قوم کا ہر فرد شہادت عظمیٰ سمجھتا تھا۔ ہندو اسے راجپال کے قتل کا بدلہ سمجھتے تھے اور فرنگی حاکم اسے سیاسی مسئلہ بنائے بیٹھے تھے۔ غازی علم الدین شہید کی تدفین کی خبر جونہی لواحقین نے لاہور والوں کو دی تو مسلمانوں نے غازی کی میت کو بہ صد احترام لاہور لائے جانے کا مطالبہ شروع کر دیا۔

29-X-31 اور 29-11-1 کی رات کو موچی دروازہ کے باغ میں مسلمانوں کا ایک بہت ہی بڑا جلسہ ہوا جس میں مجلس خلافت والے ڈاکٹر سلطان محمد، مولانا ظفر علی خان،

مولانا محمد بخش مسلم اور دیگر اکابرین نے دھواں دھار تقاریر کیں اور قرارداد پاس ہوئی کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ غازی علم الدین شہید کی میت بلا تاخیر مسلمانوں کے حوالے کر دے تاکہ شہید کی وصیت کے مطابق اسے میانی صاحب لاہور میں دفن کیا جا سکے۔

مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرنے کیلئے سر میاں محمد شفیع کی کوٹھی میں 29-11-3 کو مسلم لیگ کا ایک نہایت ہی اہم اور ہنگامی جلسہ ہوا۔ مولوی غلام محی الدین قصوری نے عوامی مطالبہ کو اکابرین مسلم لیگ تک پہنچایا جنہوں نے اسے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا۔ لہٰذا اگلے ہی دن یعنی 29-11-4 کو سر میاں محمد شفیع، سر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، سر فضل حسین، میاں عبدالعزیز، خلیفہ شجاع الدین اور مولوی غلام محی الدین قصوری پر مشتمل وفد گورنر پنجاب سر ڈی مونٹ مرنسی کو ملا اور

حسن مجسٹریٹ نے گڑھا کھود کر باہر نکلوالیا۔ گیلانی صاحب نے میت لاہور لانے کیلئے اہتمام سے ایک بکس بنوایا تھا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے میت کو بکس میں رکھا۔ قریباً دو ہفتے میت گڑھے میں رہنے کے باوجود بالکل صحیح حالت میں تھی اور اس میں تعفن نام کو بھی نہیں تھی۔ میت کو جب بصد احترام و اہتمام بکس میں بند کر لیا گیا تو ڈی سی میانوالی نے ایک سرکاری بس میں اس بکس کو ریلوے سٹیشن پر پہنچا دیا۔ اسی بس میں مراتب علی شاہ صاحب، مرزا مہدی حسن صاحب مجسٹریٹ، راجہ مہدی زمان صاحب ڈی سی اور وفد کے ارکان ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ پلیٹ فارم پر پروگرام کے مطابق پہلے ہی سے تین ڈبوں پر مشتمل ایک سپیشل ٹرین کھڑی تھی۔ اس کے ایک ڈبے میں پولیس کی بھاری تعداد موجود تھی۔ دوسرے ڈبے میں میت والا بکس، وفد کے ارکان اور قائدین وفد تھے اور تیسرے ڈبے میں غازی علم الدین شہید کے چند نہایت قریبی رشتہ دار جو شہادت کے دن سے لیکر اس دن تک میت نہ ملنے کی وجہ سے میانوالی ہی میں تھے جن کی میزبانی نیازیوں کے مشہور خاندان کے افراد نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی سوار ہوئے۔

29-11-13 کو قریباً ساڑھے چار بجے شام یہ ٹرین میانوالی سے روانہ ہوئی۔ حکومت نے مصلحتاً اس گاڑی کو راستے میں کہیں نہ ٹھہرایا لیکن اس کے باوجود قریباً ہر سٹیشن پر لائن کے دونوں طرف لوگ جوق در جوق آئے اور

شہید کی میت والی چلتی ٹرین ہی کو دیکھ کر نعرے لگاتے رہے۔ کہیں بھی کسی فساد یا ہنگامے کی اطلاع نہیں ملی۔ 29-11-14 کو صبح سویرے پانچ بجے کے قریب یہ گاڑی لاہور سٹیشن کی بجائے لاہور چھاؤنی کے سٹیشن سے ذرا پہلے نہر کے پل کے قریب روک لی گئی۔ یہ جگہ سنٹرل جیل سے قریب ترین تھی اور محفوظ بھی۔ (شادمان کالونی اس جگہ اب بن چکی ہے) یہاں جیل کی دو لاریاں پہلے ہی سے کھڑی تھیں۔ ایک میں پولیس کی بھاری تعداد بیٹھی تھی اور دوسری خالی تھی۔ ریل گاڑی سے میت والا بکس اتار کر خالی لاری میں رکھ لیا گیا اور اس کے ساتھ وفد اور اس کے دیگر ممبر اور غازی علم الدین شہید کے قریبی رشتہ دار جو میانوالی سے ساتھ آئے تھے بیٹھ گئے۔ جیل حکام نے میت والا بکس اپنے قبضہ میں لے لیا اور قریباً ساڑھے چھ بجے صبح دونوں لاریاں پونچھ ہاؤس پہنچ گئیں۔

اس جگہ سر میاں محمد شفیع، سر ڈاکٹر محمد اقبال، سر فضل حسین، مولانا غلام محی الدین قصوری، چند مسلمان میونسپل کمشنر اور چند عالم حضرات پہلے ہی سے منتظر تھے۔ انہیں آدھ گھنٹہ پہلے اطلاع دی گئی تھی کہ میت کس وقت اور کس جگہ ان کے حوالے کی جائے گی۔ جیل حکام نے سر میاں محمد شفیع اور سر علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے حوالے میت والا بکس کر دیا اور ان سے باقاعدہ تحریر لے لی کہ انہیں غازی علم الدین شہید کی میت وصول ہو گئی ہے۔ چند ایک مسلمان میونسپل کمشنروں اپنا مطالبہ پیش کیا۔

لمبی چوڑی بحث کے بعد گورنر نے کہا کہ اگر مسلمان احتجاجی جلسے کرنے، جذباتی جلوس نکالنے اور ہڑتالیں کرنی بند کر دیں مسلمان اخبارات بڑھ چڑھ کر اداریے اور خبریں بہ سلسلہ شہادت غازی علم الدین لکھنا یکدم بند کر دیں، میت کو براستہ جرنیلی سڑک (ازاں میانوالی تا لاہور) لانے کا مطالبہ نہ کریں اور میت وصول کرنے کے بعد اسے لاہور شہر کے اندر سے نہ گزارنے کا وعدہ کریں اور معززین ضمانت دیں تو پھر اس مطالبہ پر غور ہو سکتا ہے۔ 29-11-7 کو دوبارہ ملنے کا فیصلہ ہوا۔

29-11-6 اور 29-11-7 کی درمیانی شب کو معززین شہر کا ایک جلسہ میاں عبدالعزیز مالواڈہ کی کوٹھی کے ایک بند کمرہ میں ہوا۔ تفصیل سے گفتگو کرنے کے بعد جوابات گورنر سے کرنے کا فیصلہ ہوا اسے پیش کرنے کیلئے وفد جو پہلے

گورنر کو مل چکا تھا کے حوالے کر دیا گیا۔ 29-11-7 کی شب وفد دوبارہ گورنر سے ملا اور فیصلہ ہوا کہ مراتب علی شاہ گیلانی اور مرزا مہدی حسن مجسٹریٹ کی قیادت میں دو ذمہ دار مسلمان میونسپل کمشنر اور دیگر اکابرین کا ایک وفد میانوالی جائے جو اپنی موجودگی میں قبر کھدوا کر میت نکال لیں اور بذریعہ ٹرین لاہور لے آئیں۔ امن وامان قائم رکھنا بھی انہی لوگوں کی ذمہ داری ٹھہری۔

گورنر پنجاب کے ساتھ طے شدہ شرائط کے مطابق مولانا ظفر علی خان، مولانا سید حبیب، مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک نے دریں اثنا اخبارات کے سلسلہ میں خاموشی اختیار کرلی۔ جلسے کرنے اور جلوس نکالنے کی ممانعت کر دی گئی۔ عالم حضرات نے بھی زبان بند کرلی اور اپنے خطبوں میں غازی کے متعلق باتیں کرنے سے گریز کیا۔ سر میاں محمد شفیع، سر ڈاکٹر محمد اقبال، سر فیصل حسین اور مولوی غلام محی الدین قصوری نے میت کے لاہور پہنچ جانے کے بعد کے انتظامات سنبھال لئے۔

مسلمانوں کا وفد مراتب علی شاہ گیلانی اور مرزا مہدی حسن مجسٹریٹ کی قیادت میں میانوالی پہنچا۔ وفد کے ارکان میں چیدہ چیدہ اصحاب تھے۔ میانوالی کے ڈپٹی کمشنر کا نام راجہ مہدی زمان خان تھا اور وہ نیک آدمی تھے۔ 29-11-13 کو صبح سویرے شہید کی میت کو مراتب علی شاہ گیلانی اور مرزا مہدی نے بھی رسید پر دستخط کئے۔

میت والے بکس کیلئے چارپائی ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر پرنسپل اسلامیہ کالج انجمن حمایت اسلام لاہور نے عقیدتاً پیش کی تھی جس کے ساتھ بہت لمبے لمبے بانس بندھے ہوئے تھے، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ کندھا دے سکیں۔ میت اس طریقے سے جنازہ پڑھنے والی جگہ پر لے جائی گئی لوگوں کا ایک سیلاب تھا جو کندھا دینا چاہتے تھے۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے کندھا دیا بھی مگر چند اصحاب نے اپنی پگڑیاں کھول کر بانسوں کے ساتھ باندھ دیں تاکہ لوگ انہیں ہی ہاتھ لگا کر کندھا دینے والی صورت پیدا کرلیں۔ تحقیقی اندازے کے مطابق پانچ لاکھ آدمیوں نے جنازہ پڑھا جن میں دور دراز کے علاقوں کے لوگ بھی تھے۔ جس جگہ جنازہ پڑھا گیا اسے رائفل رینج کہا جاتا تھا۔

میت والا بکس

جب رائفل رینج والے میدان میں پہنچا دیا گیا تو سید حبیب سے علامہ اقبال نے پوچھا کہ جنازہ کون پڑھائے۔ انہوں نے جواباً کہا کہ شہید کے والد میاں طالعمند سے پوچھئے۔ ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں یہ حق علامہ صاحب ہی کو دیتا ہوں۔ علامہ اقبال نے سید حبیب سے مشورہ کر کے مولانا سید دیدار علی شاہ صاحب کا نام لیا، مگر وہ اس وقت تک جنازے والی جگہ پر پہنچ نہیں پائے تھے۔ لہٰذا پھر بچار ہوئی کہ کیا کیا جائے۔ دیر ہو رہی تھی۔ لہٰذا متفقہ طور پر قاری شمس الدین خطیب مسجد وزیر خان کا نام تجویز ہوا۔ اس طرح پہلا جنازہ انہوں نے ہی نے پڑھایا۔ اسی اثنا میں سید دیدار علی شاہ صاحب مولانا احمد شاہ صاحب کے ساتھ تشریف لا چکے تھے۔ یوں دوسرا جنازہ مولانا دیدار علی شاہ صاحب نے اور تیسرا جنازہ مولانا احمد شاہ صاحب نے پڑھایا۔ اس کے بعد کس کس نے جنازہ پڑھایا اس کا صحیح علم ہے نہ اندازہ کیونکہ لاکھوں فرزندان توحید جو جنازہ پڑھ چکے تھے۔ واپس جا رہے تھے اور لاکھوں لوگ ابھی آ رہے تھے جو نماز جنازہ پڑھنا چاہتے تھے۔

قبر میں اتارنے سے پہلے لحد کی لمبائی چوڑائی بکس کے حساب سے دیکھنے کیلئے مولانا ظفر علی نیچے اترے اور پھر شہید کے والد، بھائی، تایا، ماموں، خالو، مولانا احمد علی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمان لودھیانوی، مولانا غلام مرشد، مولانا محمد بخش مسلم۔

مولانا ابو ریحان سیالکوٹی

سبائی فتنہ

(حصہ اول)

قیمت 150 روپے

اہل سنت کے روپ میں رفض و سبائیت پھیلانے والے طبقہ کے خیالات کا علمی و تحقیقی محاسبہ

• ایسی کتاب جس نے بعض نام نہاد تقدس مآبوں کی حجلہ عروسی میں زلزلہ بپا کر دیا

بخاری اکیڈمی مہربان کالونی ملتان۔